POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 April 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 23-04-2026 • Price: 5/- • 1-7 May 2026 • Issue: 17 • Vol:85

یکم تا ۷/مئی ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۱۷ • جلد: ۸۵

صحتِ زبان (۴۴)

رؤف پاریکھ

پارا یا پارہ؟

رشید حسن خاں صاحب نے ایسے الفاظ کا ذکر کیا ہے جن کے آخر میں ’ا‘ (الف) لکھنے سے معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور ہائے مختفی (ہ) لکھنے سے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں، مثلاً پارا اور پارہ[۱]۔ پارا (آخر میں الف) اردو کا لفظ ہے، معنی ہیں سیماب یعنی مرکری (mercury) جو ایک کیمیائی عنصر (chemical element) ہے۔ یہ روپہلا ہوتا ہے اور تھرما میٹر یعنی حرارت پیما آلے میں استعمال ہوتا ہے[۲]۔ لیکن پارہ (آخر میں ہائے مختفی) فارسی کا لفظ ہے، معنی ہیں ٹکڑا، حصہ۔ اردو میں پارہ کا لفظ تراکیب میں بھی مستعمل ہے، جیسے ماہ پارہ یا مہ پارہ، جس کے لفظی معنی ہیں چاند کا ٹکڑا اور مجازی معنی ہیں بہت خوب صورت[۳]۔ قرآن کے تیس اجزا میں سے ایک جز کو بھی پارہ کہتے ہیں۔ اردو میں قرآن کے ایک جز کو بھی سیپارہ (ی معروف) کہتے ہیں حالاں کہ فارسی لفظ ’سی‘ کے معنی تیس (۳۰) ہیں اور سیپارہ (یا سی پارہ) کے معنی ہوئے تیس پارے۔ ایسے موقعے پر سی پارہ/سیپارہ سے مراد ہوتی ہے تیسواں حصہ، تیسواں جز، تیس پاروں میں سے ایک اور اس کا تلفظ بعض لوگ ’سِپارہ‘ یعنی ’ی‘ کے بغیر (اور ’س‘ مکسور) بھی کرتے ہیں۔ اردو میں پارہ کا لفظ تکرار کے ساتھ بھی آتا ہے، مثلاً اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے، یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے۔

پارا چوں کہ تھرما میٹر (جس کو اردو میں حرارت پیما اور مقیاس الحرارت بھی کہتے ہیں) میں بھی ہوتا ہے، اس لیے موسم کی خبریں دینے والے انگریزی میں کہتے ہیں mercury fell (پارا گر گیا) یعنی درجۂ حرارت گر گیا، گویا سردی ہوگئی اور گرمی بڑھ جائے تو کہتے ہیں mercury rose (پارا چڑھ گیا)۔ اردو والوں نے اس سے محاورہ بنا لیا پارا چڑھ جانا، جب کوئی بہت غصے میں ہوتا ہے تو کہتے ہیں ان کا پارا چڑھ گیا ہے۔

عرض یہ کرنی ہے کہ ازراہِ کرم پارا کو پارہ اور پارہ کو پارا نہ لکھا کیجیے، کہیں ایسا نہ ہو ہم جیسے کسی خُرّانٹ بڈھے کا پارا چڑھ جائے اور وہ غصے میں خود اپنی ہی کھوپڑی کو پارہ پارہ کر دے!

جُز یا جُزْو ؟

اردو میں جز (جیم مضموم، زے ساکن) اور جزو (جیم مضموم، زے ساکن، واو ساکن) دونوں مستعمل ہیں۔ عربی میں اس کی جمع ’اَجزاء‘ آتی ہے جو اَفعال کے وزن پر ہے لیکن اردو والے بغیر ہمزہ کے یعنی ’اجزا‘ بھی لکھتے ہیں۔ جز یا جزو کے معنی ہیں: ٹکڑا، پارہ، حصہ۔ اس سلسلے میں عبدالستار صدیقی نے ایک بہت عمدہ مضمون ’جزا اور جزو کی بحث‘ کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

اردو میں اس کا صحیح تلفظ ’جز‘ ہی ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں اس کا مادّہ ’ج۔ز۔ء‘ ہے (یعنی آخر میں ہمزہ) اور ’ج۔ز۔وٗ‘ ہرگز نہیں ہے، یعنی عربی لفظ کے آخر میں ہمزہ ہے، واو نہیں ہے۔ عربی لفظ ’جزء‘ (ہمزہ کے ساتھ) ہے اور بعض مثالوں میں تنوین کے ساتھ یعنی ’جـزءً‘ بھی موجود ہے۔ بعض پرانے کاتبوں نے غلطی سے عربی میں ’جزء‘ کو ’جزو‘ لکھا (یعنی آخر میں ہمزہ کے بجائے واو) اور فارسی کے اور ہمارے ہاں کے کاتبوں نے بھی غلطی یہ کی کہ اسی غلط روش کو اختیار کر لیا اور ’جزو‘ لکھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جزوِ دماغ، جزوِ بدن، جزوی اور جزوِ لاینفک فارسی میں جاری ہو گئے۔ بہارِ عجم کے مؤلف نے ’جزو‘ (واو کے ساتھ) کو اضافت کے ساتھ مخصوص کیا لیکن خود ہی جزو دان، اور جزو کشی جیسی تراکیب کو اپنی کتاب میں داخل کر لیا [یعنی وہ مرکبات جو بغیر اضافت کے ہیں لیکن پھر بھی ان میں ’جزو‘ خود اپنی رائے کے برعکس واو کے ساتھ لکھا ہے]۔ البتہ جز دان اور جز کشی (یعنی بغیر واو کے) بھی درست ہیں اور جز و کل کی ترکیب میں تو جز کا لفظ ہمیشہ واو کے بغیر ہی آتا ہے۔ اردو میں ’جز‘ فصیح ہے (یعنی بغیر واو کے) اور فارسی کے تتبع میں جزوِ بدن اور جزوِ دماغ بھی درست ہیں مگر جہاں اضافت نہیں ہے، جیسے جزدان اور جز رسی وغیرہ میں، وہاں جز (بلا واو) کو ترجیح حاصل ہے[۴]۔

اس بحث میں صدیقی صاحب نے جزا اور بجز کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا بھی اِجمال یہاں پیش ہے۔ صدیقی صاحب کے بقول جزا اور بجز کو ’غیر، مگر، سوا‘ کے مفہوم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر ان معنوں میں اس کا عربی سے کوئی تعلق نہیں اور ان معنوں میں ’جز‘ کا لفظ ٹھیٹ فارسی ہے[۵]۔

یہاں یہ ہیچ مداں اتنا اضافہ کرنا چاہے گا کہ اردو میں ’جزوی‘ اور ’جزویات‘ کے ساتھ ’جزئی‘ اور ’جزئیات‘ بھی رائج رہے ہیں اور ’جزء‘ اگرچہ اردو میں کم ہی رائج رہا ہے لیکن بہر حال بعض پرانے متون میں یہ املا بھی ملتا ہے بلکہ جزءاً (یعنی ہمزہ اور اس کے بعد الف پر تنوین) بھی ملتا ہے اور جزواً بھی۔ اسی طرح ’جزئی‘ بھی اردو میں رائج رہا ہے اگرچہ اس کا رواج اب کم ہے اور جزوی زیادہ رائج ہے۔ ان سب املوں کی اسناد بھی اردو لغت بورڈ نے اپنی لغت (جلد ششم، ۱۹۸۴ء) میں دی ہیں۔

ان الفاظ کے ضمن میں ہم جیسے طالبِ علموں کو جو الجھن ہوتی ہے اس کی وجہ ان الفاظ کے مختلف املا رائج ہونا تو ہے ہی لیکن اس الجھن کی اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اردو میں کبھی تو بجز (’سوا‘ کے مفہوم میں) کو بجز ہی لکھا جاتا ہے، مثلاً فیض احمد فیض کا مصرع ہے:

ع ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

لیکن کبھی بجز کے معنی میں ’جز‘ بھی لکھا جاتا ہے۔ جیسے غالب نے بجز (سوائے) کے معنوں میں ’جز‘ استعمال کیا ہے اور کہتے ہیں کہ:

ع جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار

اور یہ بھی کہا کہ:

ع غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ، علاج

غالب کے ان دونوں مصرعوں میں جز سے مراد بجز یعنی سوائے ہے۔ صدیقی صاحب کے خیال میں ’جز‘ (بغیر واو کے) بمعنی حصہ یا ٹکڑا کو ترجیح حاصل ہے، بشرطے کہ وہ مفرد آئے اور مرکب میں جزو (واو کے ساتھ) لکھ سکتے ہیں، جیسے: جزوِ بدن۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اردو میں جز بمعنی ٹکڑا کو مفرد صورت میں بھی کبھی جزو (واو کے ساتھ) لکھ دیا جاتا ہے، مثلاً غالب کہتے ہیں:

ع قطرے میں دجلہ دِکھائی نہ دے اور جزو میں کل

بہر حال، مختصراً یہ کہ اصل عربی لفظ جو حصہ یا ٹکڑا کے مفہوم میں ہے اس کا املا جزء (آخر میں ہمزہ) ہے مگر اردو میں اسے جز اور جزو بھی لکھا گیا اور خاص طور پر اضافت کے ساتھ جزو لکھا جاتا ہے، مثلاً جزوِ اعظم۔ لیکن ’سوا‘ کے مفہوم میں بجز ہے اور جز کو بھی کبھی اسی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے مگر اس مفہوم میں یہ فارسی ہے۔

چارا یا چارہ؟

مویشیوں کی خوراک یعنی گھاس پھوس وغیرہ جو جانور کھاتے ہیں

قارئین! اب ’ہماری زبان‘ کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

وہ چارا (آخر میں الف) کہلاتا ہے اور یہ اردو کا لفظ ہے۔ مچھلی پکڑنے کے کانٹے میں جو چیز لگائی جاتی ہے اسے بھی چارا کہتے ہیں۔ اور اسی لیے 'چارا ڈالنا' (یعنی جانوروں کے آگے گھاس وغیرہ رکھنا) تو ہے ہی لغوی معنوں میں، لیکن مجازاً چارا ڈالنا کے معنی ہیں: پھسلانے کا سامان کرنا، کسی کو پھنسانے یا کام نکلوانے کے لیے کی گئی کوئی حرکت کرنا یا بات کرنا[۶]۔ اس مفہوم میں اس لفظ کا املا 'چارا' ہے یعنی اس کے آخر میں الف ہے۔

جب کہ چارہ (آخر میں 'ہ') فارسی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: تدبیر، علاج، توڑ، مداوا وغیرہ[۷]۔ اسی لیے چارہ جوئی، چارہ ساز، چارہ سازی، چارۂ کار، چارہ گر اور بے چارہ کے آخر میں الف نہیں لکھنا چاہیے۔

دانا یا دانہ؟

پارا اور پارہ، چارا اور چارہ میں تو صورت یہ ہے (جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا) کہ ایک فارسی کا لفظ ہے اور دوسرا اردو کا، لیکن دانا بھی فارسی کا لفظ ہے اور دانہ بھی۔ دانا (آخر میں الف) یعنی عقل مند، دانش مند، ہوش مند، گیانی[۸] اور دانہ (آخر میں 'ہ') یعنی اناج کا بیج، تخم، غلّہ[۹]۔ دانہ مرکبات میں بھی مستعمل ہے، مثلاً آب و دانہ، دانہ و دام۔

فِضا یا فِضّہ؟

دونوں درست ہیں اور دونوں عربی کے لفظ ہیں۔ فِضّہ (ف کے نیچے زیر اور ض پر تشدید) کے معنی ہیں چاندی[۱۰] جسے فارسی میں نُقرہ (نون پر پیش) کہتے ہیں (اور اسی سے نُقرئی ہے یعنی چاندی کا یا چاندی کی) اور فارسی میں چاندی کو سیم (یائے معروف) بھی کہتے ہیں۔ لیکن سیم ذرا ادبی ہے اور یہ 'سیم وزر' (یعنی سونا چاندی) جیسے مرکبات میں آتا ہے۔ بعض لوگ لڑکیوں کا نام بھی فِضّہ رکھتے ہیں۔

دوسرا لفظ ہے فضا، آخر میں الف۔ فضا کے تلفظ کے بارے میں اردو میں جھگڑا ہے۔ اصولاً تو فے پر زبر ہے۔ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں فَضاء (ف مفتوح، آخر میں ہمزہ) ہے، معنی ہیں وسیع زمین، میدان[۱۱]۔ لیکن اردو میں اس کا ایک تلفظ فِضا (ف مکسور اور بلا ہمزہ) بھی ہے۔ نوراللغات نے لکھا ہے کہ فضا بفتحۂ اول صحیح۔ بکسرِ اول غلط، لیکن نور نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اردو میں زبانوں پر بکسرِ اول ہے[۱۲]۔ آصفیہ نے فضا میں پہلے حرف پر فتحہ یعنی زبر ہی دیا ہے[۱۳]۔ قاموس الاغلاط کے مطابق بالکسر یعنی فِضا غلط ہے[۱۴]۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فِضا (بالکسرِ اول) اردو کا عام اور رائج تلفظ ہے۔ اردو لغت بورڈ کی لغت نے یہ ٹھیک کیا کہ 'فضا' کا تلفظ فے مفتوح اور فے مکسور دونوں سے درج کر دیا ہے[۱۵]۔

اردو میں فضا کے عربی سے مختلف معنی بھی ہیں اور وہ ہیں: رونق، بہار، کیفیت، جوبن، دل چسپی[۱۶]۔ لیکن اردو میں فضا اب ایک نئے مفہوم میں بھی رائج ہے جو فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات میں نہیں ملتا اور وجہ یہی ہے کہ اس زمانے میں فضا کا لفظ ان معنوں میں مستعمل ہی نہیں تھا۔ وہ معنی ہیں: زمین اور آسمان کے درمیان کی وسعت، خلائے بسیط، نیز ہوا۔ اردو لغت بورڈ نے اس مفہوم کا اندراج کیا ہے اور اس کی اسناد بھی دی ہیں[۱۷]۔ گویا آج کل انگریزی میں environment کا لفظ جس مفہوم میں استعمال ہو رہا ہے، یعنی ماحول، اب اردو میں فضا کا لفظ اس مفہوم میں بھی رائج ہے، لیکن بورڈ کی تشریح اس مفہوم میں ذرا تشنہ ہے۔ جدید مفہوم میں یوں کہنا چاہیے کہ کسی مقام کی کیفیت بشمول ہوا، مٹی، زمین، پانی نیز جاندار (انسان، حیوانات، حشرات) جو وہاں کی زندگی کو متاثر کریں، فضا کہلاتی ہے۔ اسی سے اب 'فضائی آلودگی' جیسے مرکبات اردو میں مستعمل ہیں۔ اس مفہوم میں 'ماحولیاتی آلودگی' بھی رائج ہے۔

نشو وَنما

اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس ترکیب نشو وَنما میں 'نَما' (نون مفتوح) کو 'نُما' (نون مضموم) پڑھتے ہیں حالانکہ نُما تو فارسی کا لفظ ہے اور نمودن یعنی دِکھانا، ظاہر کرنا سے ہے۔ نُما یعنی دکھانے والا، اشارہ کرنے والا۔ رہ نما (یا رہنما)، راہ نما (یا راہنما) حق نما، خندۂ دنداں نما اور قبلہ نما کی تراکیب میں نما دکھانے والا یا اشارہ کرنے والا ہی کے مفہوم میں ہے[۱۸]۔ مرغِ بادنُما (ہوا کی سمت کی نشان دہی کرنے والا) میں بھی یہی نُما ہے اور قطب نما کا مطلب ہے جو قطب (pole) کی نشاندہی کرے۔ کہتے ہیں کہ جمشید کے پاس ایک پیالہ تھا جو دنیا کے حالات دِکھاتا تھا اور اس کا نام جامِ جہاں نما ہے (اس کو جامِ جم بھی کہتے ہیں)۔ اسی نُما سے نُمائی کا لاحقہ بھی ہے جو خوش نمائی، انگشت نمائی، بدنمائی، رُونمائی اور خودنمائی وغیرہ میں ہے۔

نما کا لفظ اردو میں 'مشابہ' یا 'کی طرح' یا 'جیسا' کے مفہوم میں بھی آتا ہے، مثلاً انسان نما حیوان (حیوان جو انسان سے مشابہ ہو)، گندم نما جَو فروش (جو گندم دکھا کر جَو بیچے) اور آبِ آتش نما (آگ جیسا پانی یعنی شراب)۔ جبکہ نشو وَنما عربی ترکیب ہے اور مصباح اللغات[۱۹] کے مطابق عربی لفظ 'نَشَأَة' (تلفظ: نَش۔اَت) اور 'نَشُوء' کا مطلب ہے: پیدا ہونا، وجود میں آنا۔ 'نَما' بھی عربی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے: بڑھنا، نمو پانا۔

عربی میں نشأۃ کا لفظ 'ال' کے ساتھ آتا ہے یعنی اَ لنّشأۃ (لام غیر ملفوظی اور نون مشدّد)۔ اسی سے 'نشو' (نَش۔و) ہے۔ فرہنگِ عامرہ کے مطابق 'نشو' کے تلفظ میں نون پر زبر ہے اور شین اور واو ساکن ہیں[۲۰]۔ گویا نشو و نما (اردو تلفظ: نَش۔وو۔نَما) کا مطلب ہوا (کسی چیز کا) پیدا ہونا اور بڑھنا، بالیدگی، روئیدگی[۲۱]۔

اردو میں نشو و نما کی ترکیب پرورش یا فروغ کے معنی میں بھی آتی ہے، لیکن یاد رہے کہ اس ترکیب میں نُما نہیں ہے بلکہ نَما ہے۔

حواشی:

۱۔ اردو املا (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹ء)، ص۶۹-۶۸ (دوسرا ایڈیشن)۔ رشید صاحب نے اس موقعے پر ایسے اور الفاظ بھی دیے ہیں، مثلاً چارا اور چارہ، دانا اور دانہ۔
۲۔ Oxford English Urdu Dictionary (مرتبہ شان الحق حقی) (اوکسفرڈ، کراچی، ۲۰۰۳ء) (دوسری اشاعت)
۳۔ علمی اردو لغت (مرتبہ وارث سرہندی) (لاہور: علمی کتب خانہ، ۲۰۰۵ء)۔
۴۔ مقالاتِ صدیقی (لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۰۳-۹۶۔
۵۔ ایضاً۔
۶۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۷ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۸۶ء)۔
۷۔ ایضاً۔
۸۔ فرہنگِ آصفیہ (مرتبہ سید احمد دہلوی) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔
۹۔ نوراللغات (مرتبہ نورالحسن نیر) (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۹ء)۔
۱۰۔ فرہنگِ عامرہ (مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی) (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)۔
۱۱۔ مصباح اللغات (مرتبہ عبدالحفیظ بلیاوی) (لاہور: المصباح، سنہ ندارد)۔
۱۲۔ نوراللغات، محولۂ بالا۔
۱۳۔ فرہنگِ آصفیہ، محولۂ بالا۔
۱۴۔ قاموس الاغلاط (مرتبہ سید مختار احمد و مولانا ذہین) (حیدرآباد (دکن): مکتبۂ ابراہیمیہ، سنہ ندراد)، ص۱۱۲۔
۱۵۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) ج ۱۳ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)۔
۱۶۔ فرہنگِ آصفیہ، محولۂ بالا؛ نیز نوراللغات، محولۂ بالا۔
۱۷۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۳، محولۂ بالا۔
۱۸۔ وحیدالدین سلیم، وضع اصطلاحات (کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۶۵ء)، ص۱۴۱ (طبع پنجم)۔
۱۹۔ مصباح اللغات، محولۂ بالا۔
۲۰۔ فرہنگِ عامرہ، محولۂ بالا۔
۲۱۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۲۰ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ص ۲۰۰۵ء)۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com
Mob. No.: 0322 384 2648

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-

لفظوں کے اندھیرے جنگل کا جگنو: جمال اویسی

پروفیسر مشتاق احمد

اُردو شاعری کی تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ ہر عہد میں کچھ ایسے شعرا سامنے آتے ہیں جو اپنی فکری تازگی، تخلیقی بصیرت اور فنی مہارت کے باعث ادبی منظرنامے پر نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اردو شاعری کے افق پر جو نام سنجیدگی کے ساتھ ابھرے ہیں، ان میں جمال اویسی (28 جنوری 1961–07 مارچ 2026) کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جمال اویسی اردو کی نئی نسل کے ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا اور اپنے منفرد لہجے کے ذریعے ایک الگ شناخت قائم کی۔ جمال اویسی کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ کلاسکی شعری روایت سے گہرا رشتہ رکھتے ہوئے بھی جدید عہد کے مسائل، انسانی احساسات اور سماجی حقیقتوں کو اپنے کلام کا موضوع بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک طرف فکری گہرائی ہے تو دوسری طرف جذبے کی شدت اور تخیل کی تازگی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

جمال اویسی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں عہدِ حاضر کے انسان کی داخلی کشمکش، سماجی ناانصافیاں، انسانی تنہائی اور روحانی تلاش جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کی نظموں میں علامت اور استعارہ کا استعمال نہایت بامعنی اور موثر ہے، لیکن ان کی غزلیہ شاعری بھی اپنے لہجے کے اعتبار سے منفرد شناخت رکھتی ہے۔ اب تک ان کے درجِ ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'رکا ہوا سیل' (غزل/رباعی) 2002، نظم نظم (نظمیں) 2004، شور کے درمیان (غزلیں) 2006، مصباح (رباعیات) 2007، انا پذیر (غزلیں) 2012، نقشِ گریز (نظمیں) 2017، عشق کے سوا (غزلیں) 2017۔ اس کے علاوہ ان کی تین تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں ان میں 'اویس احمد دوراں: ایک بازدید' (2015)، جدید اردو تنقید (2017) اور 'مظہر امام: نئے منظرنامے میں' شامل ہیں۔

جمال اویسی کو شاعری وراثت میں ملی تھی کہ ان کے والد اویس احمد دوراں اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غرض کہ جمال اویسی کو شعر و شاعری کا ماحول گھر سے ضرور ملا لیکن وہ فطری صلاحیت کے مالک تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کی بدولت نئی نسل کی صف میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ میں نے ان کے پہلے شعری مجموعے 'رکا ہوا سیل' پر بھی ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں ان کے شعری انفراد سے بحث کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کی شاعری کے تعلق سے یہ بات کہی تھی کہ جمال اویسی لفظوں کے اندھیرے جنگل کا جگنو ہے۔ وہ مضمون میری تنقیدی کتاب 'تنقیدی تقاضے' (مطبوعہ 2003) میں شامل ہے۔ جمال اویسی اپنی تمام کتابیں مجھے عنایت کرتے تھے اور یہ گزارش بھی کہ اس پر میں مضمون لکھوں لیکن میں انھیں بارہا یہی کہتا تھا کہ آپ کی شاعری کے تعلق سے میں نے 'رکا ہوا سیل' پر جو کچھ لکھا تھا اس پر آج بھی قائم ہوں البتہ آپ کی شاعری فکری گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے نکھرتی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمال اویسی کے شعری مجموعوں کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے شعری سفر میں جستہ جستہ نہ صرف فکر و نظر کی تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے بلکہ موضوعی اعتبار سے بھی ان کا قبلہ بدلتا رہا ہے۔ البتہ فن کی کسوٹی پر ان کی نظمیں زیادہ کسی ہوئی نظر آتی ہیں اور غزلوں میں کہیں کہیں بکھراؤ نظر آتا ہے۔

بہرکیف! جمال اویسی کی شاعری اس عہد کے انسانی کرب و اضطراب کی ترجمان ہے اور فکری و نظری اعتبار سے حقوقِ انسانی کی پاسدار بھی ہے۔ پہلے چند نظموں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ 'نقشِ گریز' (مطبوعہ 2019) ایک طرح سے ان کی نظموں کی کلیات ہے کہ اس میں 1978 سے 2016 تک کی نظمیں شامل ہیں اور خود جمال اویسی نے یہ اعتراف کیا ہے:

> ''میری نظموں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے۔ انسان اور انسانی زندگی، لیکن انسانی مسائل کی سطح پر کسی جمہور کا خواب نہ دیکھا ہے اور نہ دکھانے کی کوشش کی ہے... میری نظموں میں انسانی مسائل جدید شاعری کے مسائل بھی نہیں ہیں۔ میری نظمیں ایک سلسلہ وار فکری مکالمے کی صورت میں پڑھی جائیں تو زیادہ صحیح رہے گا''۔
>
> (نقشِ گریز۔ پیشِ لفظ، ص:27)

ظاہر ہے کہ شاعر خود یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اس کی نظموں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے، اسی تناظر میں جب ہم جمال اویسی کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں جو نظمیہ شاعری کی روایت ہے اس سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں طویل نظموں کی گنجائش ممکن نہیں، چند مختصر نظمیں ملاحظہ کیجیے۔ نظم 'باغی' کے اشعار دیکھیں:

لفظ جب گونجتا ہے گنبد میں
کرنے لگتا ہے اک شگاف وہاں
اور انسان بیکراں مخلوق
ڈرنے لگتا ہے ناگہانی سے
گر یہ گنبد نما طلسم گرا
وہ بھی نابود اگلے پل ہوگا

دوسری نظم 'عہدِ جدید کا انساں' ملاحظہ کیجیے:

میں ہوں عہدِ جدید کا انساں
بت کدہ ہے مرا وجود کہ میں
ہر نفس پوجنے میں ہوں مصروف
خانقاہِ بدن کا والی ہوں
بوسہ لیتا ہوں اپنے تن من کا
خوش ہوں آٹھوں پہر گلستاں میں
اے صبا: کاش مجھ کو عبرت ہو:

'چراغ کے لیے ایک نظم' بھی ملاحظہ کیجیے:

آخر شب اے ہمسفر دور فلک سے آئے گی
بجھتے ستاروں کی ضیا چاند کی زرد روشنی
ہم نے چراغ سب کے سب صبح کے نام کر دیے
صبحِ پیامِ کائنات جس کے طلوع کے لیے
روز چراغ جلتے ہیں اور بجھائے جاتے ہیں

ان اشعار میں شاعر نے جدید شہری زندگی کی ایک علامتی تصویر پیش کی ہے۔ روشنی کے باوجود اندھیرے کا تصور دراصل اس دور کے اخلاقی اور روحانی بحران کی علامت ہے۔ جمال اویسی کی نظموں میں انسان کی داخلی تنہائی بھی بار بار سامنے آتی ہے۔ وہ جدید انسان کے اس کرب کو محسوس کرتے ہیں جو ترقی اور آسائش کے باوجود روحانی سکون سے محروم ہے۔ ایک اور نظم کے مصرعے ملاحظہ ہوں:

— میں نے وقت کے صحرا میں کئی خواب بوئے
— لیکن ہوا نے سب چراغ بجھا ڈالے
— اب میں خاموش کھڑا ہوں اسی ویرانے میں
— جیسے خود اپنی صدا بھی مجھے پہچانتی نہیں

یہاں شاعر نے انسانی محرومی اور ناکامی کو ایک علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ صحرا اور چراغ کے استعارے شاعر کی فکری گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ جمال اویسی کی نظموں کی ایک بڑی خصوصیت ان کا علامتی اسلوب ہے۔ وہ براہ راست بیان کے بجائے علامتوں کے ذریعے اپنے خیالات کو زیادہ مؤثر اور دیرپا بنا دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں چراغ، آئینہ، دریا، رات، سفر اور شہر جیسی علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں۔ اب ان کی غزلوں کی طرف رخ کرتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جمال اویسی کی غزلیہ شاعری کے موضوعات ان کی نظمیہ شاعری سے بہت مختلف نہیں ہے بلکہ غزل میں بھی وجودی ہلاکت خیزی اور انسان کی اخلاقی پستی کو موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ اپنے شعری مجموعے 'محیط' کے پیشِ لفظ میں لکھا ہے:

> ''اب تک میری غزلیہ شاعری کے متعلقات انسان اور اس کی شکست و ریخت کی اَن گنت داستانیں رہیں''۔
>
> (ص:16)

پروفیسر وہاب اشرفی نے جمال اویسی کے شعری مجموعے 'عشق کے سوا' کے فلیپ پر بہت کارآمد باتیں کہی تھیں کہ ''جمال اویسی کے یہاں روایت کا بھی پاس ملتا ہے جسے تتبع یا نقل نہیں کہہ سکتے بلکہ نئے موضوعات کو پرانے سانچے میں سلیقے سے پیش کرنے کے عزم سے تعبیر کر سکتے ہیں''۔ بلاشبہ ان کی غزلیں کلاسکیت کی زمین میں پروان چڑھتی ہیں اور تناوری کے بعد جدیدیت کے ثمر سے بارآور ہوتی ہیں، اس لیے ان کے غزلیہ اشعار بھی ان کے ہم عصروں میں کافی مقبول رہے اور اس کے لہجے کی گونج بھی سنائی دیتی رہی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں اندھیروں سے ،اجالوں سے پرے ہوتا ہوا
صبح ہی کیا ہے مرے واسطے اور رات ہی کیا

☆

جتنے کردار ہیں ان سب کا خدا حافظ ہے
مرے افسانے میں مجھ جیسا بھی شامل نہیں کوئی

☆

سب کو ایک طرف ہے جانا چاروں سمت سے لوگ آجائیں
گونگا ایک سفر ہے جس میں گونگی ہر رودادِ بشر ہے

☆

آشفتہ نوائی مرا اکرام نہیں ہے
جس طرح میں جیتا ہوں بڑا کام نہیں ہے

☆

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

اردو اور هندی ادب هی تاریخ اور جامع علم کی بنیاد رہے ہیں: پروفیسر ابوبکر رضوی

پٹنہ (11 اپریل)۔ پاٹلی پتر یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اور بی ڈی کالج پٹنہ کے اشتراک سے چھے روزہ فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (FDP) بعنوان 'تحقیق اور علمی مباحث میں حالیہ رجحانات' کا انعقاد 6 سے 11 اپریل 2026 تک بی ڈی کالج کیمپس میں کیا گیا۔ اس پروگرام کا مقصد نوجوان محققین اور اساتذہ کو جدید تحقیقی رجحانات اور علمی مباحث کی گہری سمجھ فراہم کرنا تھا۔ آخری دن پروگرام کا افتتاح یونیورسٹی کے سینئر ماہرینِ تعلیم اور معزز مہمانوں کی موجودگی میں ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر چندن شریواستو (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ہندی، پی جی)، جے پرکاش نارائن یونیورسٹی نے مرکزی دھارے کی صحافت میں خواتین کی تحقیق کے پہلو پر اپنے خیالات پیش کیے، جب کہ ڈاکٹر ڈی این ورما (ڈائرکٹر ایس آر سی، بیر بھوم) نے قبائلی تاریخ نویسی پر مفصل خطاب کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی پروفیسر ابوبکر رضوی (رجسٹرار پاٹلی پتر یونیورسٹی) نے ایف ڈی پی کے موضوعات کے تنوع پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انھیں خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس پروگرام میں جدید تحقیقی رجحانات کے ساتھ ساتھ ادب اور تاریخ سے متعلق موضوعات کو بھی شامل کیا گیا۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کی مثال دیتے ہوئے ادب اور تاریخ کے گہرے تعلق کو اجاگر کیا اور کہا کہ کسی بھی دور کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس دور کا ادب پڑھنا ضروری ہے۔ انھوں نے پرنسپل پروفیسر رتنا امرت کو 'ڈائنامک پرنسپل' قرار دیتے ہوئے ان کی قیادت کی ستائش کی۔ شعبۂ تاریخ کے سربراہ پروفیسر اروند کمار نے اس ایف ڈی پی کو نہایت اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ تعلیمی ماحول کو مضبوط اور معیاری بنانے کی جانب ایک موثر قدم ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر منیتا کماری یادو (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ) نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پپوٹھاکر کی کتاب 'ویر کنور سنگھ: آزادی کے مجاہد' کی رسمِ اجرا بھی انجام دی گئی۔ یہ پروگرام شرکا میں تحقیق کے تئیں نئی بصیرت اور جوش پیدا کرنے، علمی مکالمے کے معیار کو بہتر بنانے اور ادارہ جاتی تحقیقی ماحول کو مستحکم کرنے کی سمت ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔

(روزنامہ 'پندار'۔ پٹنہ)

سرسیّد احمد نے اپنے دور میں تعلیم کو ترجیح دی اور قوم کو بیدار کیا

امراؤتی میں 'سرسیّد ایوارڈ فنکشن' کا انعقاد

امراؤتی (13 اپریل)۔ سرسیّد احمد خاں ایجوکیشن سوسائٹی اور پریم کشور سکھی ٹرسٹ کی جانب سے سکھی ریزارٹ دل گاؤں میں 12 اپریل 2026 کو سرسیّد ایوارڈ فنکشن کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو سرسیّد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ معروف صحافی اور روزنامہ 'منڈل' کے مدیر انل اگروال کی صدارت اور ڈاکٹر بشیر پٹیل اور یحییٰ خاں پٹھان کی قیادت میں منعقد اس تقریب میں ناگپور سے ایڈوکیٹ فردوس مرزا، امراؤتی کارپوریشن کے میئر تیجوانی، معروف ادیب و دانشور ڈاکٹر ناصر الدین انصار، امراؤتی کے ایس ڈی ایم انل بھاٹکر کے علاوہ شہر کی دیگر معروف شخصیات موجود تھیں۔

پروگرام کے منتظم یحییٰ خاں پٹھان نے افتتاحی کلمات میں سرسیّد ایوارڈ فنکشن کی غرض و غایت پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ناصر الدین انصار نے اپنے خطاب میں سرسیّد کے افکار و نظریات کے مسلم سماج پر مثبت اثرات کا نہایت خوب صورتی سے جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسیّد اور مہاتما جیوتی با پھلے نے ایک ہی وقت میں ہندستان کی دو مختلف قوموں میں اصلاحی و تعلیمی ترقی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مقررِ خصوصی ایڈوکیٹ فردوس مرزا نے کہا کہ معاشرے کی ہمہ جہت ترقی کے لیے تعلیم اور جدید ٹیکنالوجی کا متوازن استعمال ناگزیر ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ جب ماضی میں محدود وسائل کے باوجود مثبت تبدیلی ممکن تھی تو آج کے ترقی یافتہ دور میں ہم اپنی تعلیمی پالیسیوں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیوں نہیں کر پا رہے ہیں؟

امراؤتی کے میئر شری چند تیجوانی نے کہا کہ وہ سماجی خدمت کے میدان میں جدوجہد کرتے ہوئے آج اس مقام تک پہنچے ہیں۔ یہی جذبہ انھیں آج بھی عوامی خدمت کے لیے متحرک رکھے ہوئے ہے۔ اس دوران مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی درجنوں شخصیات کو سرسیّد ایوارڈ سے نواز کر معاصر سماج کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ تقریب کے صدر انل اگروال نے نہایت ولولہ انگیز صدارتی خطاب پیش کیا۔ انھوں نے کامیابی کے لیے چار بنیادی اصولوں پر زور دیا: لگن، محنت، قربانی اور خود اعتمادی۔ ان کے مطابق یہی اوصاف انسان کو اس کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ اس موقعے پر ایس ڈی او انل بھاٹکر نے تقریب میں منعقدہ تعلیمی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے منتظمین کو مبارک باد اور مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر بشیر خاں پٹیل نے رسمِ شکریہ ادا کی۔

(انقلاب۔ ممبئی)

ڈاکٹر صادق کے فن، شخصیت اور کارناموں پر دو روزہ سمینار

حیدرآباد (یکم اپریل)۔ 29-30 مارچ 2026 کو ڈاکٹر خواجہ فریدالدین صادق ممتاز افسانہ نگار، ادیب و صاحبِ دیوان، دنیائے ادب کی طویل ترین غزل (20 ہزار 220 اشعار پر مبنی) کے خالق، تاریخ وادب کے فن، شخصیت اور کارناموں پر دو روزہ سمینار کا انعقاد اردو گھر مغل پورہ میں عمل میں آیا، جس کا آغاز پروفیسر انورالدین چیئرمین اشرف المدارس کی قرأت کلام پاک اور گووندا اکشے کی نعت پاک سے ہوا، جس کی صدارت قاضی محمد سراج الدین رضوی نے کی، نظامت کے فرائض جناب سہیل عظیم اور شکیل حیدر نے انجام دیے۔ ڈاکٹر صادق نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کی۔ ڈاکٹر دردانہ مسکان، نورالدین امیر، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، جاوید نسیم، نجیب احمد نجیب، پروفیسر انورالدین اور زاہد ہریانوی تھے۔ مقالہ نگاروں نے مختلف عناوین پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر انورالدین (حسینی علم ڈگری کالج) کا مقالہ ڈاکٹر دردانہ مسکان نے پیش کیا اور محترمہ سیّدہ سمیرا کا سہیل عظیم نے پیش کیا۔ پروفیسر انورالدین (چیئرمین اشرف المدارس) نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر دردانہ مسکان نے اپنا مقالہ 'ڈاکٹر صادق کا دینی سفر جامعہ نظامیہ کا' پیش کیا۔ جاوید نسیم اور نجیب احمد نجیب نے بھی مقالے پیش کیے۔ مرحوم ڈاکٹر عباس متقی کا ڈاکٹر صادق پر لکھا گیا خاکہ بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر مجاہد ہلال اعظمی نے ڈاکٹر صادق کے فن، شخصیت اور کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ قاضی محمد سراج الدین رضوی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر صادق جیسا شخص میں نے نہیں دیکھا۔ تمام ادیبوں اور شاعروں، مقالہ نگاروں اور سامعین کی بھی ادارے کی جانب سے ڈاکٹر صادق نے گل پوشی اور شال پوشی کی۔ دو روزہ نیشنل سمینار میں حصہ لینے والے مقالہ نگاروں کو سند سے نوازا گیا۔ تمام حاضرین محفل کے لیے پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر صادق کی صدارت میں طرحی و غیر طرحی مزاحیہ/سنجیدہ مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں حسبِ ذیل شعرا و شاعرات نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر خواجہ فریدالدین، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، ڈاکٹر محمد انورالدین، نورالدین امیر، شکیل حیدر، سہیل عظیم، نجیب احمد نجیب، جاوید نسیم (کلکتہ)، گووندا اکشے، مجاز نرملی، حمید سحر، خلش حیدرآبادی، جلیس بھارتی، زاہد ہریانوی، رضوان بیابانی، حفیظ راحیل، خادم رسول عینی، صغیر حسین صغیر، ڈاکٹر اکبر، ایم اے سلیم، ڈاکٹر دردانہ مسکان، ثنا الماس باوزیر، سیّدہ سمیرہ (دہلی) و دیگر شعرا نے کلام سنایا۔ رات ڈیڑھ بجے یہ کامیاب سمینار و مشاعرہ ڈاکٹر صادق کے شکریے پر اختتام پذیر ہوا۔ (رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

تلنگانہ اردو اکیڈمی ڈائری کی رسمِ اجرا

حیدرآباد (28 مارچ)۔ تلنگانہ اردو اکیڈمی کی خوب صورت اور ضخیم ڈائری کی رسمِ رونمائی وزیر برائے اقلیتی بہبود جناب محمد اظہر الدین کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ 2026 کی سوغات کے طور پر تازہ تصاویر، اہم ٹیلی فون نمبرس اور ضروری معلومات سے مزین اس ڈائری کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے جناب محمد اظہر الدین نے نیک خواہشات پیش کیں اور مستقبل میں اردو اکیڈمی کے لیے خوش آئند منصوبوں کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر جناب طاہر بن حمدان (صدر تلنگانہ اردو اکیڈمی) نے کہا کہ اردو اکیڈمی ہر طرح کے حالات میں کام کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ انھوں نے ڈائری کی اشاعت پر تمام محبانِ اردو اور اردو اکیڈمی کے عملے کو مبارک باد پیش کی۔ اس خوشگوار موقعے پر جناب محمد اظہر الدین، جناب طاہر بن حمدان کے علاوہ جناب عبیداللہ کوتوال (صدر نشیں اقلیتی مالیاتی کارپوریشن حکومتِ تلنگانہ)، جناب محمد اسداللہ (ڈائرکٹر/ سکریٹری تلنگانہ اردو اکیڈمی)، وی کرشنا (اسسٹنٹ ڈائرکٹر)، جناب عطاء اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ، جناب شیخ اسماعیل سپرنٹنڈنٹ، جنیداللہ بیگ جونیر اسسٹنٹ اور دیگر موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

'مغربی بنگال میں اردو تنقید، امتیازات و امکانات' پر یک روزہ سمینار کا انعقاد

کولکاتا (29 مارچ)۔ مژگاں فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام بہ اشتراک مغربی بنگال اردو اکادمی یک روزہ سمینار بہ عنوان 'مغربی بنگال میں اردو تنقید: امتیازات و امکانات' کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت کلیم حاذق نے کی جس میں ممتاز محقق اور درجنوں کتاب کے مصنف ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، ڈاکٹر عمر غزالی اور جناب مقصود دانش نے اپنے مقالے پیش کیے، جس میں مغربی بنگال میں اردو: ماضی و حال، بنگال میں اردو تنقید کے امتیازات، بنگال میں اردو غزلیہ شاعری کی تنقید، بنگال میں اردو تنقید کی نئی جہات اور بنگال میں اردو ناول کی تنقید؛ یہ پانچوں مقالے بے حد شاندار اور قابلِ تعریف رہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر عمر غزالی، ابوذر ہاشمی اور ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے نئی جہت کی تلاش کی۔ مقصود دانش کا مقالہ بے حد معلوماتی تھا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت انجم عظیم آبادی نے کی جس میں ڈاکٹر دبیر احمد، جناب جاوید ہمایوں، ڈاکٹر سنجر بلال بھارتی اور ڈاکٹر رضی شہاب نے مقالے پیش کیے جس میں ڈاکٹر دبیر احمد کا مقالہ بے حد شاندار رہا۔ جناب جاوید ہمایوں اور ڈاکٹر سنجر بلال بھارتی کا مقالہ بھی پسند کیا گیا۔ انجم عظیم آبادی نے آخر میں بطورِ صدر خطاب کیا۔

آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر دبیر احمد نے کی جس میں ڈاکٹر غالب نشتر، ڈاکٹر محمد فاروق، ڈاکٹر اختر پرویز، ڈاکٹر مظفر علی اور محمد زہیب عالم نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس پروگرام کے روحِ رواں ڈاکٹر نوشاد مومن تھے جن کی سخت محنت سے یہ پروگرام کامیاب رہا۔ انھوں نے پہلے سیشن کی نظامت بھی کی۔ (روزنامہ 'عوامی نیوز'۔ کولکاتا)

مدھوبنی میں اردو تقریری مسابقہ کا انعقاد

مدھوبنی (11 اپریل)۔ اردو ڈائرکٹوریٹ محکمۂ کابینہ سکریٹریٹ حکومتِ بہار کے زیرِ ہدایت ریاستی اسکیم مالی سال 2025-26 کے تحت 2+ واٹسن ہائی اسکول مدھوبنی کے ہال میں اردو داں طلبہ و طالبات کے حوصلہ افزا تقریری مسابقہ کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز جناب سنتوش کمار اے. ڈی. ایم، جناب نتیش کمار او. ایس. ڈی، جناب سیّد سرفراز ڈائرکٹر ڈی. آر. ڈی. اے مدھوبنی کلکٹریٹ و جناب معراج احمد ترجمہ افسر مع انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی کے ہاتھوں شمع افروزی کے ذریعے کیا گیا۔ شمع افروزی سے قبل جناب معراج احمد ترجمہ افسر نے پودا دے کر سبھی مہمانان کا استقبال کیا۔ جناب سنتوش اے. ڈی. ایم نے اردو کے آغاز وارتقا پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اردو دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی کھڑی بولی سے پیدا ہوئی۔ اردو کی شیرینی و لطافت پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی۔ جنات نتیش کمار او. ایس. ڈی مدھوبنی کلکٹریٹ نے اردو کی تاریخی حیثیت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ہندستان کی دیگر سبھی زبانوں میں اردو اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ جناب سیّد سرفراز احمد ڈائرکٹر ڈی آر ڈی اے مدھوبنی نے اس پروگرام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس پروگرام میں درجِ ذیل بچوں نے اول، دوم وسوم درجات میں مقام حاصل کیا۔ اول میٹرک: محمد ریحان، انٹرمیڈیٹ: عبادالرحمٰن، گریجویشن: ابوشحمہ، دوم میٹرک: محمد ریاض ورومی پروین و دلشاد انصاری، انٹرمیڈیٹ' مقصودہ خاتون، حبیبہ خاتون، خوشبو خاتون، گریجویشن: نغمہ الفردوسی، محمد صفدر انصاری و مریم فردوس، سوم میٹرک: محمد بلال، بشریٰ خاتون، محمد معراج و محمد شمشاد، انٹرمیڈیٹ: غاشیہ، منیرہ پروین، نکہت آرا و نصرت پروین، گریجویشن: منتشا پروین، تذکرہ خاتون، مبشرہ پروین و شاکرہ پروین۔ پروگرام میں بحیثیت حکم (جج) پروفیسر یاسمین اختر سی. ایم. جی. کالج، کھٹونا، پروفیسر منور عالم راہی آر این کالج پنڈول، ڈاکٹر صغری مسرور، ڈی. بی. کالج، جے نگر، پروفیسر محمد عبداللہ، آر. کے کالج مدھوبنی و ڈاکٹر محمد حسین معلّم 2+ ہائی اسکول سریسو پاہی پنڈول موجود تھے اور انھوں نے بخوبی اپنے فرائض کو انجام دیا۔ پروگرام کے ابتدائی حصّے کی نظامت واصف جمال اور بقیہ حصّے کی نظامت محمد مہتدی نے کی۔ اس پروگرام میں جناب رضا علی سینئر لیڈر جدیو و جناب مظہر جمال سابق پرکھ بسفی بلاک بھی شریک تھے۔ مسابقے میں کامیاب بچوں کو مومینٹو، میڈل، سرٹیفکیٹ کے ساتھ اردو رسالہ بھی تحفے میں دیا گیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

سہیل عمر کے شعری مجموعے 'خیال' کا اجرا

بھوپال (31 مارچ)۔ سہیل عمر کی شاعری کی عمر کم ضرور ہے لیکن ان کی شاعری میں جو تجربات بیان کیے گئے ہیں وہ صدیوں کا حاصل ہیں۔ انھوں نے عام فہم زبان میں تشبیہ و استعارے کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے عصری مسائل کو جس طرح پیش کیا وہ اہمیت کا حامل ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز دانشور و محقق ڈاکٹر مہتاب عالم نے سہیل عمر کے شعری مجموعے 'خیال' کی رونمائی کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ سہیل عمر کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے، شعور وادراک کے ساتھ پیش کی گئی ان کی شاعری میں فلسفیانہ فکر موجود ہے جو انھیں حوالوں میں زندہ رکھے گی۔ سہیل عمر کی خاص بات یہ ہے کہ شاعری کا فن انھیں اپنے والدین سے وراثت میں ملا اور پھر انھوں نے مشہور استاد شاعر ڈاکٹر احسان اعظمی سے مشورۂ سخن کر کے اپنے فن کو آگے بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے کلام کو اہلِ نظر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

محمود زکی ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام ہوٹل فلفورا میں منعقدہ شاندار تقریب میں پروگرام کے مہمانِ خصوصی نغمہ نگار شکیل اعظمی نے سہیل عمر کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے سہیل عمر کو اپنے مطالعے کو وسیع کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ پروگرام کے صدر ممتاز استاد شاعر ظفر صہبائی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سہیل عمر بھوپال کے شعری افق پر ابھرنے والے میرے پسندیدہ شعرا میں شامل ہیں اور انھوں نے سہیل عمر کے اولین شعری مجموعے کی رونمائی پر انھیں مبارک باد پیش کی۔ اس سے قبل اپنی کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سہیل عمر نے کہا کہ میرے لیے یہ خوشی کا موقع ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے تجربات کو جو شعری رنگ دیا تھا اس کی رونمائی کے موقعے پر بھوپال کی مقتدر شخصیات موجود ہیں۔ 'خیال' میں صرف میرے ہی خیال نہیں ہیں بلکہ زندگی کے سفر میں جو کچھ تجربات حاصل ہوئے ہیں انھیں پیش کیا گیا ہے۔ یہ میرے شعری عشق کا پہلا پڑاؤ ہے جس کی رونمائی میں آپ لوگوں نے شرکت کر کے میری زندگی کی اس شام کو یادگار بنایا ہے۔

اس موقعے پر مقتدر شخصیات موجود تھیں، اس میں نمایاں طور پر ممتاز ادیب اقبال مسعود، نامور استاد شاعر و محقق ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی، روزنامہ 'نیا نظریہ' کے مدیر و ناشر ڈاکٹر نظر محمود، مشہور شاعر وجے تیواری، روزنامہ 'ندیم' کے نمائندے سلمان خاں، سماجی کارکن عظیم بیگ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض معروف صحافی و ناظم ڈاکٹر مہتاب عالم نے بہ حسن وخوبی ادا کیے۔ (روزنامہ 'ندیم'۔ بھوپال)

'عورت: آگہی اور اظہار' کے عنوان سے
'ہم نشیں' کی ادبی نشست

بھیونڈی (2 اپریل)۔ شہر کی معروف علمی اور ادبی تنظیم 'ہم نشیں' نے شہرِ ادب بھیونڈی میں ادبی فضا کو ہموار کرنے اور شہر کے جونیر اور سینئر اُدبا کو پلیٹ فارم مہیا کرنے کی غرض سے ماہانہ ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس ضمن میں پانچویں ماہانہ ادبی نشست بہ عنوان 'عورت: آگہی اور اظہار (یومِ خواتین کی مناسبت سے)' کا انعقاد 31 مارچ 2026 کو صبح ساڑھے دس بجے رابعہ گرلز ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج میں کیا گیا۔ اس یادگار ادبی تقریب کی صدارت معروف ادبی شخصیت اور جی ایم مومن ویمنز کالج کی سابق صدر شعبۂ اردو وحیدہ حفیظ الرحمٰن مومن نے فرمائی۔ محفل کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ ہم نشیں کی جوائنٹ سکریٹری صوفیہ مومن نے افتتاحی کلمات کے ساتھ پروگرام کی غرض وغایت بیان کی۔ بعد ازاں ساجدہ جمال (شاعری)، حنا فرحین مومن (افسانہ)، منیبہ مومن (افسانہ)، فردوس انجم (افسانہ)، انشا فاروقی (شاعری) نے اپنی تازہ تخلیقات پیش کیں۔ پیش کردہ تمام تخلیقات کو سامعین کی جانب سے خوب پذیرائی ملی۔ جویریہ قاضی (پرنسپل کے. ایم. ای. ایس. ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج، پڑگھہ) نے اس موقعے پر موجود تمام خواتین سے خصوصی خطاب کیا۔ اس موقعے پر ہما ضیاء الرحمٰن انصاری، شاداب جمال مومن، تبسم مومن، منصفہ مومن، مسکان مرزا، کبریٰ انصاری نے سامعین سے خطاب کیا اور خواتین کے مختلف مسائل سے متعلق اظہارِ خیال کیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

شعبۂ اُردو ناگپور یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام
'خاکہ نگاری ورکشاپ'

ناگپور (2 اپریل)۔ راشٹرسنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام ایک روزہ خصوصی 'اردو ورکشاپ' کا انعقاد 23 مارچ 2026 کو کیا گیا، جس میں ماہرینِ فن نے اردو اصناف بالخصوص خاکہ نگاری کے فنی و تاریخی پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت صدرِ شعبۂ اُردو ڈاکٹر سنتوش گرہے نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے زائد نصابی سرگرمیوں کی اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر سنتوش نے اردو کی مختلف اصناف کا ذکر کرتے ہوئے خاکہ نگاری کے کینوس پر بحث کی اور بتایا کہ کس طرح ایک بہترین خاکہ کسی شخصیت کے باطنی اور ظاہری پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ورکشاپ میں مقررین نے طلبہ کو فنِ خاکہ نگاری کے رموز سے واقف کرایا۔ یحییٰ جمیل (مقررِ خصوصی صدر شعبۂ فارسی کیسر بائی لاہوٹی کالج امراوتی) نے خاکہ نگاری کی تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے اردو کے شاہکار خاکوں کی خصوصیات بیان کیں۔ انھوں نے چند منتخب خاکوں کو بطورِ نمونہ پیش کر کے طلبہ کو اس صنف کی باریکیوں سے روشناس کرایا اور شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر ثمیر کبیر پر بہت ہی خوب صورت انداز میں خاکہ پیش کیا اور پروفیسر اسرار احمد (سیٹھ کیسری مل پوروال کالج) نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ خاکہ نگاری کے فنی لوازمات پر گفتگو کی۔
(انقلاب۔ ممبئی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی

میرٹھ۔ ملک کے معروف وممتاز عالمِ دین، جامعہ گلزارِ حسینہ اجراڑہ کے مہتمم اور آل انڈیا ملّی کونسل نئی دہلی کے قومی صدر مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی کا علالت کے سبب 4 اپریل 2026 کی شب نمازِ عشاء کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کی خبر نہ صرف ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئی، جس سے علمی اور دینی حلقوں میں گہرے رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ گذشتہ شام مولانا کی طبیعت اچانک ناساز ہوگئی جس پر انھیں فوری طور پر میرٹھ کے ایک اسپتال میں منتقل کیا گیا، تاہم تمام ترطبی کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ انتقال کی خبر ملتے ہی ان کے عقیدت مند، شاگرد، علمائے کرام اور عوام کی بڑی تعداد جامعہ گلزارِ حسینہ اجراڑہ پہنچی جہاں رات بھر لوگ اپنے محبوب قائد کی آخری زیارت کرتے رہے۔ 5 اپریل کو نمازِ ظہر کے بعد جامعہ کے احاطے میں مولانا ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی کی قیادت میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں علمائے کرام، سماجی وسیاسی شخصیات اور علاقے کے لوگوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔ جنازے کے بعد مرحوم کو اجراڑہ کے جھانڈی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں شرکا نے مرحوم کی دینی، علمی اور ملّی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ان کا انتقال ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔ رات میں ہی مولانا کے بیٹے مولانا ڈاکٹر عبدالمالک مغیثی کو جامعہ گلزارِ حسینیہ کا مہتمم مقرر کیا گیا، جب کہ دیگر دو بیٹے بھی عالمِ دین ہیں۔ مولانا کی پانچ بیٹیاں بھی ہیں۔ مرحوم نے اپنی زندگی دینِ اسلام کی خدمت، تعلیم وتربیت اور ملّت کی رہنمائی میں گزاری اور ان کی شخصیت علم، عمل اور اخلاق کی بہترین مثال تھی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کی مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

آفتاب عالم شاہ نوری کی کتاب
'محمد بن قاسم سے بہادر شاہ ظفر تک' کی رسمِ اجرا

بیدر (5 اپریل)۔ کرناٹک ریاستی لسانی اقلیتی اسکول اساتذہ ویلفیئر ایسوسی ایشن بنگلورو، ضلع یونٹ چکوڑی کے زیرِ اہتمام بروزِ اتوار 5 اپریل 2026، پنج محلّہ بال چکوڑی میں اردو اسکول داخلہ مہم کے موقعے پر معروف شاعر ومصنف آفتاب عالم شاہ نوری کی کتاب 'محمد بن قاسم سے بہادر شاہ ظفر تک' کی شاندار رسمِ اجرا DDP چکوڑی آر ایس سیتا رامن صاحب اور گوکاک کے BEO اور دیگر معزز شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آئی اور ساتھ ہی ساتھ طلبہ کی تہنیتی تقریب کامیابی سے منعقد کی گئی اور مصنف کو اس اہم تاریخی کتاب کی تصنیف پر مبارک باد پیش کی گئی۔ مبارک باد پیش کرنے والوں میں شہر کی سرکردہ شخصیات پیش پیش تھیں۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام رسالہ : سہ ماہی 'اردو ادب' (میر تقی میر نمبر)
مدیران : صدیق الرحمٰن قدوائی، اطہر فاروقی
شمارہ : جولائی 2024 تا جون 2025
ضخامت : 320 صفحات
قیمت : 500 روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایوینیو نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

خدائے سخن میر تقی میر کا ہر زمانے میں طوطی بولتا رہا ہے۔ غالب ہوں کہ ناسخ، سب نے میر کو استاد تسلیم کرتے ہوئے ان کی اردو شاعری کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے میر کی خدمات کے اعتراف میں ان کی پیدائش کے تین سو سال مکمل ہونے پر 2024 میں ان کی بڑائی، ان کی اردو کے لیے کی گئی کاوشوں پر علمی مباحث کا سلسلہ بڑی جرأت مندی کے ساتھ جشن میر 22 جنوری 2024 سے 8 فروری 2025 تک مسلسل جاری رکھا۔

خدائے سخن میر تقی میر پر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے پہل کرتے ہوئے منظّم انداز سے بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا تھا، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت میں شعبۂ اردو کی ادبی انجمن کی سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھی، یہ بات 1983 کی ہے، اس کا ایک گروپ فوٹو میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کے مقالات ماہ نامہ 'آجکل' دہلی کے مارچ 1984 کے خصوصی شمارے میں شائع ہوئے تھے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اور رسالہ سہ ماہی 'اردو ادب' کے مدیر اپنے وقت کے جید عالم اور نابغہ شخصیات رہی ہیں۔ موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نہایت بالغ نظر شخصیت ہیں، ان کا مسلک ہے 'ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم'۔

اطہر فاروقی دُھن کے پکے اور کام کے دھنی ہیں، جو بھی کام کرتے ہیں جنون کی حد تک اس سے جڑ جاتے ہیں، جس کا ثبوت اردو دنیا نے دیکھا کہ انھوں نے میر تقی میر کی پیدائش کا تین سو سالہ جشن پورے سال بڑے وسیع پیمانے پر ان کے شایانِ شان نہایت منظّم طور سے اس طرح منایا کہ دنیا انگشت بدنداں ہے۔ یہ تقریبات پورے سال دہلی کی الگ الگ عمارتوں میں اپنے جلوے بکھیرنے کے ساتھ میر کے بلند آہنگ سے ہم سب کو متعارف کراتی رہیں۔ جشن میر 22 جنوری 2024 سے شروع ہو کر ذکر میر کی مکمل اشاعت کے ساتھ اختتام کو پہنچا اور 'ذکرِ میر' کی رونمائی ہوئی۔ ڈاکٹر صدف فاطمہ وہ محنتی اور علم کی جویا نسائی ادب کی منفرد خاتون ہیں، جو عالمہ ہیں یعنی دینی مدارس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیوی تعلیم میں اپنی ذہانت اور مہارت کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں، ان کو اردو و فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بڑی حد تک یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ ڈاکٹر صدف فاطمہ نے ذکر میر کے آخری حصّے کا جو فارسی میں ہے نہایت سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے اور حواشی بھی لکھے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی نے ایک سال کے جشن کی منعقدہ تقاریب پر ہی اکتفا نہیں کیا، انھوں نے اپنے رسالے 'اردو ادب' کے 103 سال مکمل ہونے پر اس کا 'میر تقی میر نمبر' بھی نکالا اور اپنے قارئین کو اس جشن میں غائبانہ شریک کیا۔ میر پر یہ مجلّہ 320 صفحات پر محیط ہے، اس میں مدیرِ اعلا پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی قدوائی صاحب کے اداریے کے علاوہ پندرہ مضامین شامل اشاعت ہیں۔ صدیق الرحمٰن صاحب کے مطابق:

> "جشن کی تین سو سالہ تقریبات کے اختتام پر 'اردو ادب' کے خصوصی نمبر کی اشاعت اس اعتبار سے بھی مبارک ہے کہ اس سہ ماہی مجلّے کی اشاعت کے 103 سال مکمل ہو چکے ہیں۔ اس شمارے کا منصوبہ تیار کرتے وقت یہ طے کیا گیا تھا کہ اس میں کسی دیگر زبان میں شائع شدہ بے حد اہم مضمون کی شمولیت کے علاوہ کوئی مطبوعہ تحریر شائع نہیں کی جائے گی'۔ (ص:5)

جس پر عمل کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دنیا بھر میں اردو کا وہ واحد ادارہ ہے جس نے میر کے تین سو سالہ جشن کا اہتمام نہایت سنجیدگی اور باوقار طریقے سے کر کے اردو دنیا کی توجہ اس اہم تاریخی شاعر کی عظمت کی طرف مبذول کرائی۔

اردو ادب کے اس خصوصی شمارے کا پہلا مضمون اردو اور میر کے کلام کے عاشق اور محقق رنجیت ہوسکوٹے جو انگریزی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ہیں کا مضمون 'میر کی راہ پر' ہے۔ انھوں نے میر کے اشعار کا ترجمہ 'The Homeland's an ocean: Mir Taqi Mir' کے عنوان سے کیا ہے اور سلمان خورشید کے ساتھ یہ سیر حاصل گفتگو پر محیط ہے جو بین الاقوامی سطح پر میر کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ انگریزی سے اس کا اردو ترجمہ نریش ندیم اور ڈاکٹر صدف فاطمہ نے نہایت مہارت سے کیا ہے۔ فارسی کے مایۂ ناز عالم پروفیسر شریف حسین قاسمی کا میر تقی میر کے 'منظوم و منثور فارسی آثار' کا اردو ترجمہ عنوان کے تحت دہلی کی روشنی میں اس وقت کے حالات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر بیدار بخت کا 'میر کے چند محاوراتی اشعار' ہے جس میں انھوں نے میر کے محاوراتی اشعار کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ تیسرا مضمون پروفیسر معین الدین عقیل کا ہے، یہ مضمون تحقیقی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں میر کی 'مجموعۂ نیاز' نام کی تالیف کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں مختلف موضوعات پر بیشتر شعرا کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس میں میر کا اپنا منتخب کلام بھی شامل ہے جو فارسی میں ہے۔ چوتھا مضمون اخلاق آہن کا 'میر کی فارسی شاعری' ہے۔ فارسی کے شعرا عموماً کسی نہ کسی پابندی یا کسی بڑے شاعر کا تتبع کرتے تھے۔ اخلاق آہن کہتے ہیں: 'کچھ استثنا کے ساتھ میر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے واحد شاعر ہیں جو کسی بنے بنائے قالب کے پابند اور پیرو نہیں ہیں'۔ (ص:106) اس مضمون میں میر کے فارسی کلام کے کچھ نئے پہلو نکل کر سامنے آئے ہیں۔ 'میر کی دلی گنگا جمنی تہذیب اور علم و ادب کا گہوارہ' مضمون اطہر فاروقی کی ژرف نگاہی کا شاہد ہے، لکھتے ہیں:

> "میر کی شاعری اور دلّی میں درد و کرب کا ایسا رشتہ ہے جو اُن کی شخصیت اور شہر کی تفہیم دونوں میں معاون ہوتا ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ اٹھارویں صدی کی دہلی کا مزاج میر کے لب و لہجے میں پوشیدہ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا"۔ (ص:119)

سردار جعفری اور رالف رسل کے مضامین قند مکرر کے طور پر شامل کیے گئے ہیں۔ سرور الہدیٰ نے اپنے مضمون 'آبِ حیات اور میر' میں محمد حسین کی تحقیق کو صحیح ثابت ہونے کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اردو ادب کے چند لوگوں نے "شروع سے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ آزاد کو چھوٹا ثابت کرنا ہے"۔ اس سلسلے میں کئی باتیں اور واقعات کو آزاد کا ذہنی اختراع قرار دیا گیا تھا۔ میر کا لکھنؤ میں پڑھا گیا معروف قطعہ اور کتابچہ 'فیضِ میر' جو انھوں نے اپنے لیے لکھا تھا، ان دونوں باتوں کی اطلاع عام قاری کو آبِ حیات سے ملیں، سرور الہدیٰ کہتے ہیں کہ 'یہ دو مثالیں بتاتی ہیں کہ میر کے تعلق سے آزاد کی اطلاعات کتنی اہم ہیں'۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے 'آبِ حیات' کو پڑھنے کی بھی تلقین کی ہے۔

خالد ندیم کے مضمون 'تلمیحاتِ میر: انبیاے کرام کے حوالے سے' میں میر کے فکر و فن کے اُسلوبِ نگارش پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ ان کے کلام کی اہمیت میں اضافہ کا موجب ہوا اور بعد کے کئی شعرا اس سے متاثر ہوئے اور رہنمائی حاصل کی۔ انھوں نے مذہبی حوالہ جات اور تلمیحات کے استعمال میں اپنے عہد کے واقعات کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا الگ اور خصوصی مضمون ہے۔

ارجمند آرا کے ساتھ ان کے شاگرد نے جس طرح دھوکہ دیا، ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی اس کا حال انھوں نے مضمون 'کلاسکی غزل پڑھنے سے پہلے' میں درج کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان اور انسانیت پر سے اعتماد اُٹھتا محسوس ہوتا ہے۔

'علمی اختلاف' عنوان کے تحت محمود احمد کاوش کا مضمون 'میر تقی میر کا غیر مطبوعہ دیوانِ ہفتم' ہے، اس میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ اکثر جگہ غزلوں کے اشعار میں خاصا لفظی اختلاف پایا جاتا ہے، اس سے ان کے کلام میں جاذبیت میں مزید اضافہ ہوا۔ میر کے اس اندازِ سخن کے پڑھنے سے کئی شعرا نے رہنمائی حاصل کی ہے۔ کئی جگہ غزلوں کے اشعار میں خاصا لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تحقیق و تدوین کا کام انتہائی احتیاط کا ہے، یہاں 'یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد' والا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ نازک کام ہے، یہاں تو سانس بھی آہستہ لینا پڑتا ہے، ذرا سی بے احتیاطی سے بہت غلط نتائج برآمد ہو سکتے ہیں"۔
> (ص:261)

عنوانِ 'ارمغانِ انجمن ترقی اردو (ہند)' کے تحت صدف فاطمہ نے 'لطائفِ میر کا اردو ترجمہ مع فارسی متن' میں میر تقی میر کے لطائف کا بامحاورہ سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فارسی متن بھی موجود ہے۔

اپنے تمام مشمولات کے ساتھ یہ شمارہ بہت وقیع ہے، میر کے کلام کو سمجھنے اور ان کے دور سے آگاہ ہونے کے لیے طالب علم اور میر سے شغف رکھنے والے قاری کے لیے بھی اپنے اندازِ فکر و نظر کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے، جو میر کی عظمت کو آشکار کرتا ہے۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی اور ان کی پوری ٹیم کی میر شناسی کے لیے اس پوری ایک سالہ جدوجہد اور میر کو بھولے بسرے عوام اردو داں طبقے میں مقبول بنانے میں معاون ہوئی، یہ بڑی بات ہے۔

اس شمارے کو ہر لائبریری میں گوشہ میر کی زینت ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ میر سے محبت اور عقیدت رکھنے والے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

◆◆◆

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

لفظوں کے اندھیرے جنگل کا جگنو: جمال اویسی

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

میں بدن کے دار پر جس روز لٹکایا گیا
ہر ستارہ سرنگوں تھا یاد آتا ہے مجھے
تصادم ہے مجھ میں کئی قرنوں کا
نیا آدمی ہوں پر اسرار میں

☆

میں چراغِ کشتہ کے آگے جھکا روتا رہا ہوں جانے کتنی دیر تک
سر اٹھایا جب یہ دیکھا آسماں سا بن کے چھایا ایک گہرا دود ہے

☆

تم آئے بیٹھے ذرا دیر، پھر چلے بھی گئے
نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آسماں بدلا

☆

میں تجربوں کی روشنی میں کہہ رہا ہوں کچھ
مرکوز میری ذات ہو تو بیشمار ہوں

مذکورہ اشعار صرف ایک شہر کی تصویر نہیں بلکہ پورے عہد کی علامت ہیں۔ جمال اویسی کی غزلیہ شاعری بھی ان کی ادبی شناخت کا اہم حصہ ہے۔ اگر چہ ان کی نظموں میں فکری وسعت زیادہ نمایاں ہے، لیکن ان کی غزلوں میں جذبات کی شدت اور زبان کی لطافت قابلِ توجہ ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسکی اردو غزل کی روایت بھی جھلکتی ہے اور جدید عہد کے احساسات بھی۔ یہ اشعار شاعر کے داخلی تجربے اور فلسفیانہ سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ جمال اویسی کی شاعری کی زبان سادہ، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے بجائے عام فہم زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی یہی سادگی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ جمال اویسی کی شاعری کا ایک اہم پہلوان کا سماجی شعور ہے۔ وہ اپنے عہد کے مسائل سے بے خبر نہیں بلکہ ان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ناانصافی، ظلم اور انسانی محرومیوں کے خلاف ایک خاموش احتجاج ملتا ہے۔ مثلاً ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

یہ کیسا شہر ہے جہاں خواب بھی بکتے ہیں
اور سچ بولنے والوں کو تنہا کر دیا جاتا ہے

یہ شعر ہمارے عہد کی تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جمال اویسی کی شاعری میں رومانویت بھی موجود ہے۔ ان کے بعض اشعار میں محبت اور انسانی رشتوں کی لطافت کا خوب صورت اظہار ملتا ہے۔ مثلاً:

تیری یادوں کا چراغ دل میں جلائے رکھوں
رات کتنی بھی ہو تاریک اجالا ہوگا

یہ شعر امید اور محبت کے احساس سے لبریز ہے۔ اردو کے بعض ناقدین کے مطابق جمال اویسی کی شاعری میں جدید عہد کی فکری پیچیدگیوں کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کے کلام میں نہ صرف فکری گہرائی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی صداقت بھی پائی جاتی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جذباتی اظہار کے ساتھ ساتھ فکری استدلال کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام محض جذباتی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی مضبوط نظر آتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جمال اویسی کی شاعری میں چند نمایاں خصوصیات سامنے آتی ہیں:

(1) فکری گہرائی اور فلسفیانہ انداز
(2) علامتی اور استعاراتی اظہار
(3) زبان کی سادگی اور شستگی
(4) سماجی شعور اور انسانی ہمدردی
(5) روایت اور جدیدت کا حسین امتزاج

یہ تمام خصوصیات انہیں نئی نسل کے معتبر شعرا کی صف میں اہم مقام عطا کرتی ہیں۔

جمال اویسی اردو شاعری کی نئی نسل کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے اردو ادب میں ایک معنی خیز اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں انسان کی داخلی دنیا، سماجی حقیقتیں اور جمالیاتی احساسات ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ اردو شاعری کی روایت آج بھی زندہ اور متحرک ہے۔ جمال اویسی جیسے شعرا اس روایت کو نہ صرف آگے بڑھا رہے ہیں بلکہ اسے نئے فکری اور تخلیقی امکانات سے بھی روشناس کرا رہے ہیں۔ یقیناً جمال اویسی کا شعری سرمایہ آنے والے زمانوں میں بھی اردو ادب کے قارئین اور ناقدین کے لیے باعثِ دلچسپی اور قابلِ مطالعہ رہے گا۔ افسوس صد افسوس کہ اردو کی نئی نسل کا ایک نمائندہ شاعر 7 مارچ 2026 کی شب میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا لیکن اس کا شعری سرمایہ دنیائے ادب میں اسے ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا کہ اس کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ جمال اویسی کے انتقال کی خبر سن کر میں نے ایک مختصر سی نظم بطور خراجِ عقیدت تحریر کی تھی، ملاحظہ کیجیے:

آج کتابوں کی الماریوں میں
اک خاموشی اتر آئی ہے
لفظوں کے پرندے
اپنے گھونسلوں میں سمٹ گئے ہیں
اور چاک کی طرح گھومتی ہوئی
وقت کی میز پر
ایک چراغ آہستہ آہستہ بجھ گیا ہے
جمال اویسی!
تم تو وہ مسافر تھے
جو لفظوں کے اندھیرے جنگل میں
آندھیوں کی زد پر
خیالوں کے چراغ جلاتے تھے

پرنسپل، سی. ایم. کالج، دربھنگہ (بہار)
موبائل: 9431414586
ای میل: rm.meezan@gmail.com

تخلیقی ادراک: ذہن، خیال اور ایجاد کا فلسفہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

سے ہم آہنگ ہوں، اور یہی تصور ہمیں تخلیقی ادراک کی فلسفیانہ بنیادوں تک لے جاتا ہے جہاں وجود، خیال اور حقیقت کا باہمی رشتہ زیرِ بحث آتا ہے، افلاطون کے نزدیک تخلیقی عمل مثلِ اعلا کی طرف سفر ہے اور فنکار محسوس دنیا کی ناقص اشیا میں کامل صورتوں کی جھلک دریافت کرتا ہے، اسی لیے اس نے شاعری کو ایک طرح کی الہامی دیوانگی کہا۔ ارسطو نے تخلیق کو فطرت کی تقلید ضرور مانا مگر اسے محض نقل کے بجائے تکمیل کا نام دیا اور فن کو انسانی نفس کے تزکیے کا ذریعہ سمجھا، ہیگل کے ہاں تخلیقی عمل مطلق روح کے تاریخی ارتقا کا اظہار ہے جو مختلف ادوار میں علامتی، کلاسکی اور رومانی صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ شوپنہار کے نزدیک فنکار تخلیق کے لمحے میں ارادے اور خواہش کے جبر سے عارضی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ نطشے نے تخلیق کو دیونے سی بے ساختگی اور اپالونی ترتیب کے امتزاج سے تعبیر کیا اور اعلا فن کو ان دونوں قوتوں کے توازن سے مشروط کیا، جب کہ وجودی فلسفے میں سارتر اور کامیو کے نزدیک تخلیقی عمل انسانی آزادی اور ذمہ داری کا سب سے بامعنی اظہار ہے جس کے ذریعے انسان اپنے وجود کو معنی عطا کرتا ہے۔ اسی تناظر میں تخلیقی ادراک کا مابعدالطبیعیاتی سوال یہ بنتا ہے کہ تخلیق کا سرچشمہ کہاں ہے، جس کا ایک جواب الہامی نظریات میں ملتا ہے جہاں یونانی روایت میں میوزز، اسلامی تصور میں الہام اور رومانوی فکر میں عظیم روح سے وابستگی کو بنیاد بنایا گیا، دوسرا جواب عقلیت پسندوں کے ہاں ہے جہاں ڈیکارٹ عقل کو وجود کی بنیاد اور کانٹ تخیل کو عقل اور فہم کے درمیان کا پل قرار دیتا ہے۔ تجربیت پسند لاک اور ہیوم کے نزدیک تخلیق حسی تجربات اور تاثرات کی ترکیب ہے، جب کہ ماورائی مفکرین کے مطابق فرد میں کائناتی روح کا عکس موجود ہوتا ہے اور فطرت تخلیقی الہام کا بنیادی منبع ہے، نفسیاتی سطح پر فرائڈ نے تخلیقی عمل کو لاشعوری خواہشات کی سماجی طور پر قابلِ قبول تسکین قرار دیا اور خواب و تخیل کو اس کا اظہار سمجھا۔ یونگ کے نزدیک فنکار اجتماعی لاشعور اور آرکی ٹائپس سے رابطہ قائم کرتا ہے اور تخلیق دراصل عملِ تفرد کا حصہ ہے، گیسٹالٹ نفسیات تخلیق کو مکمل تصویر دیکھنے اور اجزا کے درمیان نئے رشتے دریافت کرنے کی صلاحیت سمجھتی ہے، جب کہ انسانیت پسند نفسیات میں ماسلو اور راجرز تخلیقی صلاحیت کو انسان کی فطری خود شکلی کی خواہش سے جوڑتے ہیں جہاں ارفع تخلیقی لمحات وقت اور مکان کی قید سے ماورا ہو جاتے ہیں۔

تخلیقی عمل کی نفسیاتی حرکیات کو سمجھنے کے لیے گراہم والاس نے تیاری، نمود، انکشاف اور تصدیق کے چار مراحل بیان کیے جن میں مسئلے کی تفہیم سے لے کر لاشعوری پرورش، اچانک بصیرت اور عملی جانچ تک کا سفر شامل ہے، دیگر نمونوں میں کوسٹلر کا پانچ مرحلہ ماڈل، چرچل کا سات مرحلہ تصور اور تخلیقی حلِ مسئلہ کا عملی خاکہ بھی اسی عمل کی مختلف جہات کو واضح کرتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیت کے نفسیاتی اجزا میں سیالیِ فکر، اصالت، لچک، تفصیل اور حساسیت شامل ہیں جو انسان کو روایتی سانچوں سے ہٹ کر سوچنے، نئے زاویے دریافت کرنے اور امکانات کو پہچاننے کے قابل بناتے ہیں، تاہم اس پورے عمل میں نفسیاتی خوف، سماجی دباؤ، تعلیمی و تنظیمی جمود، علمی تعصّبات اور سرمایہ دارانہ نظام کے کنٹرول جیسی رکاوٹیں بھی حائل رہتی ہیں جو تخلیقی ادراک کو محدود، منظّم یا مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یوں تخلیقی ادراک ایک ہمہ جہت انسانی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے جو فلسفہ، مابعدالطبیعیات، نفسیات اور سماجی ساخت کے باہمی تعامل سے جنم لیتا ہے اور انسان کو محض موجود حقیقت کو قبول کرنے کے بجائے اسے ازسرِ نو معنی دینے کی قوت عطا کرتا ہے۔

Mob. 03214468216

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس
جان بارتھ وِک گل کرسٹ
تالیف و ترجمہ
صدیق الرحمٰن قدوائی
قیمت: 250 روپے

تخلیقی ادراک

ذہن، خیال اور ایجاد کا فلسفہ

فرحت عباس شاہ

تخلیقی ادراک کی ماہیت اور وسعت پر بحث سے پیشتر یہ بہت اہم ہے کہ پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ تخلیقی عمل ہے کیا۔

عمل تخلیق

میں یہاں عملِ تخلیق کے بارے میں اپنی اس تعبیر، تعریف اور توضیح کو یکجا اور مربوط صورت میں پیش کر رہا ہوں جس پر میں مختلف اوقات میں غور کرتا رہا ہوں اور جسے میں نے اپنی کتاب 'فلسفۂ ادراک' کے ایک مستقل باب کی حیثیت دی ہے۔ میرے نزدیک تخلیق کی موزوں ترین تعریف یہ ہے کہ نامعلوم کے معلوم میں آنے اور پھر معلوم کے وجود میں ڈھلنے کی جمالیات کو تخلیق کہا جائے، اور بعض اوقات یہی عمل معلوم سے وسیع تر معلوم اور اس وسیع معلوم سے وجود کے مرحلے تک پھیل جاتا ہے، جس کی تفصیل آگے چل کر مزید واضح ہوتی جائے گی۔ ادبی یا فنی تخلیق دراصل وہ باضابطہ مظہر ہے جو انسان کی باطنی اور خارجی ریاضت کے تعامل سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ باطنی ریاضت سے میری مراد خیال، جذبے، احساس، سوچ اور ادراک کی ریاضت ہے، جب کہ خارجی ریاضت میں تجربہ، مشاہدہ، مطالعہ اور ابلاغی مہارتوں کی مسلسل مشق شامل ہے۔ اسی تناظر میں میں نے شعر کے اس لطیف اور غیر مرئی تانے بانے کے مابعد الطبیعیاتی مآخذ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے جسے میں تخلیق یا شعر کے مابعد الطبیعیاتی اسٹرکچر کا نام دیتا ہوں۔ عملِ تخلیق کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی بنیادی اکائی المیہ ہے۔ اگرچہ فنونِ لطیفہ میں طربیہ کے مظاہر کا کلی انکار ممکن نہیں، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ المیہ طربیہ کی نسبت زیادہ گہرا، زیادہ وسیع اور زیادہ مؤثر ہے، اور اس پر اہلِ علم و دانش کم و بیش متفق نظر آتے ہیں۔

تخلیق کا ایک فطری وصف اس کا ارتقائی ہونا ہے، اور یہی فطری ارتقا اس عمل کو، نقل، دہرائے جانے، تصنع اور بناوٹ سے محفوظ رکھتا ہے، کیوں کہ جب فطرت استاد بن جائے تو تخلیق جنگلی پودوں کی طرح بغیر کتر بیونت کے اپنے قدرتی انداز میں آگے بڑھتی ہے، جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تخلیق میں اکتساب سے زیادہ انجذاب کی مہک نمایاں رہتی ہے، اگرچہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تخلیق کار فنی قواعد، شعری محاسن و معائب یا اسرار و رموز سے ناواقف ہوتا ہے، یا وہ جنگل کی ماہرانہ تراش خراش سے اسے باغ بنانے کا قائل نہیں ہوتا۔ اصل فرق صرف یہ ہے کہ وہ کسبِ فن کو تخلیقی عمل پر غالب نہیں آنے دیتا۔ یہ بھی ایک حسین حقیقت ہے کہ اکثر شاعر عشق و محبت کے لازوال جذبوں اور ہجر و فراق کی بے مثال کیفیات سے اپنی تخلیقی مسافت کا آغاز کرتے ہیں، کیوں کہ یہ وہ تجربات ہیں جن سے تقریباً ہر خوش نصیب انسان گزرتا ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کیفیات کو کلام میں ڈھالنے کی صلاحیت عطا ہو جانا بذاتِ خود ایک بڑی نعمت ہے۔ ادراک کی بنیادی تعریف کے مطابق انسان کا ذہن معلومات کو منظّم طریقے سے عمل میں لاتا ہے، جس میں مظاہر، یادداشت اور معنویت کا انصرام شامل ہوتا ہے، اور شاعری میں یہی عمل تخلیقی سطح پر ظاہر ہوتا ہے جہاں شاعر حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک نئی معنویت تشکیل دیتا ہے اور اسے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صفحات کے حوالے کر دیتا ہے۔ عملِ تخلیق کا سب سے لطیف پہلو کیفیت ہے، جو ہر تخلیق کار کو شدتوں کے مختلف تناسب سے ودیعت ہوتی ہے؛ یہی اندرونی لرزش تخلیق کو جنم دیتی ہے، اور زبان پر کامل عبور اور ہنرِ مصرع سازی کے باوجود اگر یہ اضطراب موجود نہ ہو تو شاعری محض صورتِ امکان بن کر رہ جاتی ہے۔ میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ایک واجبی سا تخلیقی عمل بھی کئی منظّم، منصوبہ بند اور طویل اکتسابی مراحل سے گزرے ہوئے کام سے کہیں زیادہ بلند اور مؤثر ہوتا ہے، البتہ اس کے ساتھ یہ بھی ناگزیر ہے کہ لکھنے والا اپنے اندر علم کی پیاس رکھنے والا طالبِ علم ہمیشہ زندہ رکھے، خود کو منوانے کی خواہش میں بحث برپا کرنے کی بجائے دوسروں کی بات اور کتاب کو جاننے اور محسوس کرنے کے ارادے سے پڑھے، تعمیری مکالمہ کرے اور کسی بھی قسم کے علمی زعم سے بچے، کیوں کہ علم اتنا وسیع اور گہرا ہے کہ اس پر زعم کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ پہلے سے تخلیق شدہ ادب کی نقالی ادیب کے لیے زہرِ قاتل ہے، کسی کے کلام یا تحریر پر ہاتھ صاف کرنے کی بجائے اپنے دل کی آواز اور ذہن کی بینائی پر بھروسا کرنا چاہیے، کیوں کہ بڑا ادیب بننے سے پہلے اوریجنل ہونا زیادہ ضروری ہے، اور جب کوئی اوریجنل ہوتا ہے تو وہ لازماً منفرد بھی ہوتا ہے، آگے پھر ہر تخلیق کار کی استعداد اور توفیق پر منحصر ہے کہ وہ کتنی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشّمس ہے کہ تخلیق اور تخلیقی ادب سراسر درونِ ذات کا معاملہ ہیں، جب کہ کرافٹ اور لیپا پوتی خارجی امور ہیں؛ حقیقی آمد کا کلام، مصوری یا دُھن اپنا کرافٹ اور کئی مرتبہ تو ہیئت تک اپنے ساتھ لے کر آتی ہے، اور نظرِ ثانی یا نوک پلک سنوارنا بھی اسی تخلیقی عمل کا تسلسل ہے، اس کے بغیر کوئی حیثیت نہیں بنتی، میں اس وضاحت کی ضرورت بار بار محسوس کرتا ہوں کہ کوئی بھی سنجیدہ تخلیق کار نظرِ ثانی اور فنی تراش خراش کی ضرورت سے انکار نہیں کرتا۔ تخلیقی عمل مجھے تخلیقِ انسان اور تخلیقِ کائنات کے عمل کی یاد دلاتا ہے، وہی حیرت، وہی جنم اور وہی باطنی صدا، اور اسی لیے فکری شعور اور تخلیقی عمل ایک دوسرے کی نفی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تقویت کا سبب بنتے ہیں۔ فلسفۂ ادراک کی رو سے شاعر کا ادراک اس کے تخلیقی عمل کی اساس ہوتا ہے، اور تخلیقی عمل بذاتِ خود ایک خودمختار اور آزاد عمل ہے جو جس طرح چاہے، جس کے لیے چاہے، جہاں اور جب چاہے وقوع پذیر ہو سکتا ہے، خواہ وہ جمالیات کے لیے ہو، روحانیات کے لیے ہو یا کسی سائنسی یا سماجی مقصد کے تحت ہو، ہر صورت میں یہ اخلاص اور خیر کی بنیاد پر ہوتا ہے اور مادی مفاد سے ماورا رہتا ہے؛ چالاکی، مکاری اور مفادات کے تحت کیا جانے والا کام تخلیقی ادب سے مشابہ تو ہو سکتا ہے مگر حقیقی ادب نہیں بن سکتا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ شاعری نامعلوم سے کشید کیے ہوئے زندہ منظر کو معلوم میں لانے کا نام ہے، اور اگر یہ خیر کا عمل ناخالص نہ ہونے دیا جائے تو دلوں کے عالم بدلنے کی قوت رکھتا ہے، ورنہ گھڑی ہوئی، نقل بمطابق اصل کوئی ادب پارہ یا تصویر وقتی طور پر چونکا تو سکتی ہے مگر ذہن اور دل پر دیرپا اثر چھوڑنے سے قاصر رہتی ہے۔ آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ بھی میرے تجربے کا حصہ ہے کہ بعض اوقات تخلیق کار کسی خارجی مہیج اور تحریک کے ذریعے تخلیقی عمل کو حرکت میں لاتا ہے اور کئی دفعہ داخلی تحرک اور اندرونی اسٹی مولیشن ہی اس عمل کو متحرک کر دیتی ہے، اور یہی غیر یقینی مگر بامعنی کیفیت عملِ تخلیق کی اصل روح ہے۔

تخلیقی ادراک محض نئی چیزوں کے بنانے کا نام نہیں، بلکہ یہ وجود، حقیقت اور امکانات کے نئے دائرے دریافت کرنے کی نفیس ترین انسانی صلاحیت ہے۔ تخلیقی ادراک درحقیقت انسانی ذہن کا وہ معجزہ ہے جو معلوم سے نامعلوم کی طرف، موجود سے ممکن کی طرف، اور ظاہر سے باطن کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں فرد اپنی ذات کی حدود کو پار کر کے کائناتی شعور سے رابطہ قائم کرتا ہے، اور نئے معانی، نئی شکلیں اور نئے رشتے دریافت کرتا ہے۔

تخلیقی ادراک کی تعریف مختلف مفکرین نے اپنے اپنے فکری، فلسفیانہ اور نفسیاتی تناظرات میں یوں کی ہے کہ جان ڈیوی کے نزدیک یہ پرانے خیالات کے درمیان نئے تعلقات قائم کرنے کا عمل ہے، کارل راجرز اِسے ایسی نئی اشیا یا تصورات کو وجود میں لانے کی صلاحیت قرار دیتا ہے جو مفید، بامعنی اور تسلی بخش ہوں، جب کہ مائیکل مہونگ کے مطابق تخلیقی ادراک ایسے خیالات یا مصنوعات کی تخلیق ہے جو بیک وقت اصل، متاثر کن اور اپنے سیاق و سباق ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***